ندیم انبالوی

اگر دعاؤں سے کام چل سکتا تو.....

(چند یادیں)

ایک دفعہ میں شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے حسب عادت آٹو گراف کے لئے بک ان کی طرف بڑھائی۔ شاہ جی فرمانے لگے، میں تو ایک درویش آدمی ہوں۔ یہ باتیں لیڈروں کو زیب دیتی ہیں۔ بھائی، میں لیڈر نہیں ہوں۔ میں نے بہت اصرار کیا، مگر شاہ جی نہ مانے۔ شاہ جی، لاہور تشریف لے جانے کے لئے ملتان اسٹیشن پر فروکش تھے۔ راقم نے تصویر لینے کی خواہش ظاہر کی تو فرمایا نہیں بھائی! میرے افکار ہی میری تصویر ہیں۔ انہیں اپنالو تو ان ہی میں میرا عکس نظر آئے گا۔

ایک صاحب شاہ جی سے باتیں کر رہے تھے۔ دوران گفتگو انہوں نے کہا، شاہ جی! اس دور کے انسانوں کو سکون کی زندگی نصیب نہیں ہے۔ ہر شخص مصائب کی چکی میں پس رہا ہے۔ فرمایا... بھائی مسلمان قرآن اور حدیث پڑھنے کی بجائے شکسپیئر کے ڈرامے پڑھنے لگے ہیں۔ مصائب سے نجات کیوں ہو؟۔ سکون نصیب ہو تو کیسے؟ تحریک ختم نبوت کے زمانے میں شاہ جی سے کسی نے کہا۔ شاہ جی ایسے کام نہ کیجئے جن سے آپ کو تکلیف برداشت کرنا پڑے۔ اب آپ ضعیف ہیں۔ ضعیف العمری کا تقاضا ہے کہ اب آپ آرام کریں۔ شاہ جی نے بڑے جلال سے کہا۔ ناموس رسالت ﷺ خطرے میں ہے۔ اغیار، شمع رسالت بجھانے کے درپے ہیں اور تم ہو کہ مجھے آرام کرنے کا مشورہ دے رہے ہو؟ بھائی تم مجھے یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میں خود کشی کرلوں؟ بخاری زندہ ہو اور خاموش رہے؟ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ ان صاحب کی یہ حالت تھی کہ..... کاٹو تو لہو نہیں بدن میں!

شاہ جی اپنے مکان کی بیٹھک میں تشریف فرما تھے۔ ان کے قریب ہی بہت سے عقیدت مند فروکش تھے کہ اتنے میں ایک بڑھیا آئی اور کہا۔ میری بیٹی جوان ہے۔ پیسے نہیں ہیں۔ میں اس کی شادی کیسے کروں؟ شاہ جی فوراً اندر تشریف لے گئے اور کپڑے کی ایک تھیلی بڑھیا کے حوالے کر دی۔ وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔

اور یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے..... تب میں روزنامہ "ستلج" بہاول پور میں سٹاف رپورٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا، اشتہارات کے فقدان اور نیوز ایجنٹوں کے عدم تعاون کی بناء پر روزنامہ "ستلج" مالی بحران کا شکار ہو گیا۔ پہلے یہ اخبار چار صفحات پر چھپتا تھا، پھر دو پر آ گیا۔ پھر ایک دن ایسا بھی طلوع ہوا کہ مسٹر علی احمد رفعت نے روزنامہ "ستلج" کو بند کرنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی کیونکہ ان کے پاس جو بھی پونجی تھی وہ اس کی نذر کر چکے تھے۔ میری ملازمت ختم ہو گئی اور مجھے یہاں سے رخصت ہونا پڑا۔

اس وقت ملتان سے صرف روزنامہ "نوائے وقت" نکلتا تھا اور اس کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر مسٹر ہمایوں ادیب تھے۔ میں بہاولپور سے ملتان پہنچا۔ ملازمت چلی جانے سے ذہنی طور پر بے حد پریشان تھا۔ میں ریلوے سٹیشن سے سیدھا شاہ جی کے دولت کدہ واقع کوٹلہ تولے خاں پہنچا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے دروازہ پر دستک دی۔ چند ساعتوں کے بعد دروازہ کھلا اور شاہ جی کو بنفس نفیس اپنے سامنے پا کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایشیا کا سب سے بڑا خطیب مجھے اس سعادت سے نوازے گا۔ علیک سلیک کے بعد میں نے اپنا تعارف کرایا اور اپنے والد مرحوم کا نام بتایا تو شاہ جی نے جذباتی انداز میں مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور آبدیدہ ہو گئے۔ بڑی شفقت سے کافی دیر تک میرے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔

شاہ جی اپنے کمرے میں دری پر تشریف فرما ہو گئے۔ میں بھی دوزانو ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ شاہ جی مرحوم ماضی میں کھو گئے اور ایام رفتہ کا تذکرہ کرنے لگے۔ پھر فرمایا کہ کیسے آنا ہوا؟ میں نے عرض کیا کہ شاہ جی ملازمت سے جواب مل گیا ہے۔ بیروزگاری سے سخت ذہنی کرب و اذیت میں مبتلا ہوں۔ اب ملازمت کے لئے ملتان آیا ہوں۔ دعا فرمائیں کہ مجھے اخبار میں ملازمت مل جائے۔

شاہ جی نے میری بات سن کر خاموشی اختیار کر لی۔ پھر تھوڑے توقف کے بعد فرمایا کہ میرے بھائی! دعاؤں پر تکیہ کرنے کی بجائے جدوجہد کیجئے۔ اس کے ساتھ ساتھ رب العزت کی بارگاہ میں دعا کیجئے میں شاہ جی کا یہ جواب سن کر افسردہ سا ہو گیا۔ انہوں نے میری پریشانی کو بھانپ لیا اور فرمانے لگے کہ میرے نانا (حضور اکرم ﷺ کو شاہ جی ہمیشہ نانا ہی کہا کرتے تھے) کا اسوہ حسنہ قیامت تک نوع انسانی کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی پوری عملی زندگی جدوجہد کا بہترین نمونہ ہے۔ حضور اکرم نے قدم قدم پر مصائب برداشت کیے، کفار سے جنگیں لڑیں حتیٰ کہ ایک جنگ میں آپ کے دندان مبارک شہید ہو گئے۔

یہ درست ہے کہ مسلمان کے لئے دعا آخری ہتھیار ہے لیکن اس ہتھیار کو استعمال کرنے کے علاوہ عملی زندگی میں سعی و جہد بھی نہایت ضروری ہے۔ اسلام اور حضور ﷺ کی تعلیمات بھی یہی ہیں لیکن پیشہ ور پیروں اور دنیا دار درویشوں نے آقائے نامدار ﷺ کی ان مقدس تعلیمات کے علی الرغم تعویذ گنڈوں کو جلب زر کا ذریعہ بنا لیا اور وہ مشکلات میں گرفتار لوگوں کی جیبوں پر خوب ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اس ملت میں ایسے بھی پیر پیدا ہوئے جنہوں نے عربوں کے خلاف انگریز کی حمایت میں لڑنے والے سپاہیوں کو تعویذ دیئے کہ انہیں بازوؤں پر باندھ لینے سے دشمن کی گولی ان پر اثر نہیں کرے گی۔ ایسے لوگ دین کی پیشانی پر ایک بدنما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بھائی! میں ان میں شامل نہیں ہوں۔

شاہ جی فرمانے لگے کہ بھائی اگر صرف دعاؤں سے کام چل سکتا تو ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی اور اس کے بعد قیام پاکستان تک چلنے والی تحریکوں میں لاکھوں مسلمان تہ تیغ نہ ہوتے، ہزاروں کی املاک برباد نہ ہوتیں اور نہ انگریزی سامراج سے اتنی طویل جنگ لڑنا پڑتی بلکہ ہم بہت پہلے انگریز کو برعظیم سے نکال چکے ہوتے۔ بھائی! وقتی مصائب سے گھبرانے کی بجائے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔ یہی شیوۂ مردانگی ہے۔ جائیے

جدوجہد کیجئے اور اس کے ساتھ دعا بھی! اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہیں۔ جلد وہ رزق کی بہم رسانی کا کوئی نہ کوئی ذریعہ بنادیں گے۔ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔

میں جب شاہ جی سے مصافحہ کر کے باہر نکلا تو بے روزگاری کی وجہ سے میرے دل و دماغ پر جو پریشانی غالب تھی وہ کافور ہو چکی تھی اور میں ہشاش بشاش ہو کر ملازمت کی تلاش میں نکل پڑا۔ تب سے میں نے محنت کو، جدوجہد کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔ ہر موقع پر خدا کی نصرت میرے شامل حال رہی اور آج تک کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھا۔ اب جب بھی ابتلاو آزمائش کا کوئی مرحلہ پیش آتا ہے تو میں یوں محسوس کرتا ہوں کہ جیسے شاہ جی مجھے ہمت و استقلال کی تلقین فرما رہے ہوں اور میں مشکلات سے دل برداشتہ اور دل گرفتہ ہونے کی بجائے اپنے ان کا مقابلہ کرنے کی نئی قوت اور توانائی کار فرما پاتا ہوں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے میرے والد مرحوم کے سالہاسال سے تعلقات تھے۔ اور جس وقت شاہ جی نے میدانِ سیاست میں قدم رکھا اور تحریکِ خلافت کے سلسلہ میں جدوجہد شروع کی اس وقت والد صاحب پنجاب میں خلافت کمیٹی کے صدر تھے۔ یہ تعلقات ۱۹۲۱ء میں شروع ہوئے اور میرے والد صاحب کی زندگی تک قائم رہے۔ والد صاحب کی وفات سے پانچ سال قبل میں نے ۱۹۳۷ء میں لاہور میں وکالت شروع کر دی تھی۔ مگر شاہ جی کی شفقت میرے ساتھ اس سے سالہاسال پہلے سے تھی۔ اور مجھ پر ان کی عنایت آخری ایام تک رہی۔ آخری زمانہ میں شاہ جی سیاست سے دست کش ہو چکے تھے۔ اور ملتان میں سکونت نے مستقل صورت اختیار کر لی تھی۔ اس زمانہ میں بھی جب بھی مجھے ملتان جانے کا موقعہ ملا۔ شاہ جی نے اکثر یاد فرمایا۔ اور مجھے فیضِ صحبت سے مستفیض کیا۔

میرے لئے شاہ جی کی حیثیت سیاسی رہنما سے بڑھ کر ایک مُشفق بزرگ کی تھی۔ جس کا چالیس سال میں نے احترام کیا۔ اور جنہوں نے مجھ سے محبت کی۔ میں نے جب سیاست میں دخل دینا شروع کیا تو ہماری راہیں ایک نہ تھیں مگر اس کے باوجود نہ ان کی عنایات میں فرق آیا نہ میرے احترام میں۔

میں نے شاہ جی کے خطبات بھی سنے ہیں۔ میں اب بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ زور بیانی کے ساتھ جو شیرینی ان میں موجود تھی وہ بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ ہزارہا لوگ گھنٹوں ان کی تقریر سنتے۔ اور ان کی خوبیٔ تقریر پر سر دُھنتے تھے۔ غالباً اپنے زمانہ میں وہ اور نواب بہادر یار جنگ مسلمانوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ مقررین تھے۔ گو دونوں کا رنگ جدا تھا۔ مگر درازیٔ تقریر اور شیریں مقالی دونوں میں مشترک تھی۔

ذاتی زندگی میں درویشی ان کی نمایاں تھی۔ عشقِ رسول کے ساتھ توحید پر اصرار انہی خصوصیات تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی مرتبہ انہوں نے قید و بند کے مصائب کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ اور تحریک تحفظ ختم نبوت میں سپہ سالاری کے فرائض انجام دیئے۔

انہیں تو لازماً مرنا تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ آج ہماری قوم نہ صرف ایسی جلیل القدر ہستیوں کو آہستہ آہستہ فراموش کر رہی ہے بلکہ موجودہ دور میں ایسے اصحاب کے وجود سے محروم بھی ہو رہی ہے۔

میاں محمود علی قصوری مرحوم بار ایٹ لاء